باب پنجم

اقبال کے نظریۂ اجتہاد کا ایک جائزہ

علامہ اقبال بیسویں صدی کے ایک عظیم المرتبت اسلامی مفکّر کے طور پر ابھرے۔ آپ ملت مسلمہ کی زبوں حالی اور اضمحلال کے خاتمہ کے لئے نئے طرزِ فکر و عمل کے زبردست خواہاں تھے جو قرآن وسنت کی روح کے مطابق ہو۔ قرآن کو شاہ کلید قرار دیتے ہوئے آپ اسے ایک زندہ و پائندہ حقیقت جان کر اس کی تعلیمات کو لازوال قرار دیتے ہیں۔ انہی عوامل کی بناء پر آپ اجتہاد پر کافی زور دیتے رہے تاکہ قرآن وسنت کی حرکی، اور زندہ تشریح وتوضیح کر کے اسے زمانۂ جدید کی سیاسی، ثقافتی، عمرانی، تعلیمی اور معاشی تقاضوں کے اہل بنایا جائے۔ انہی بیش بہا تقاضوں کی تکمیل کے لئے اقبالؒ نے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے خطبات پیش کئے ہیں۔ عصر جدید میں اجتہاد کے حوالے سے اُن کی مربوط و مدلّل فکر اسلامی انہی خطبات میں نمایاں نظر آتی ہے۔ انہی وجوہات کی بناء پر سید مظفر الحسن نے ان خطبات کو ذہنی مائدہ (Intellectual Feast) قرار دیا ہے۔ آپ اقبالؒ کے ان خطبات کو نہ صرف عظیم اصولوں کی شاندار تشریح قرار دیتے ہیں بلکہ علمائے وقت کے لئے ان لیکچرز کو ''معنی خیز ذہنی تحریک'' (Pregnant Suggestions) کا نام دیتے ہیں۔[1]

دراصل اسلام کے وسیع وعمیق مطالعہ سے اقبالؒ کو ایسی وسعتِ قلبی نصیب ہوئی تھی کہ انہیں جہاں اور جس فلسفے میں بھی کوئی خوبی نظر آتی تھی تو وہ ایسے نوعِ انسانیت کا مشترک ورثہ جان کر بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنا لیتے تھے۔ فکر اقبال کی اسی وسعت کے تناظر میں سید وحیدالدین کہتے ہیں:

> ''اقبال کا مخصوص اندازِ فکر یہ ہے کہ وہ ایک طرف تو مغربی فکر سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن مغربی فکر پر تکیہ کر کے نہیں بیٹھتے بلکہ قرآنی بصیرتوں سے اس کی تصحیح اور تکمیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن حکیم نے عالم خلق کو عالمِ امر

سے ممتاز کیا ہے۔ وہ فکر کے نئے راستے کھولتا ہے''[۲]

عبدالمغنی علامہ اقبال کی اجتہادی کاوشوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اجتہاد و اعتماد کے ساتھ حکمائے مشرق اور فلاسفۂ مغرب کے قدیم وجدید نظریات خرد کو قرآن کے اصولِ دانش کی کسوٹی پر پرکھ کر فکر انسانی کے مسلسل ارتقاء کا سراغ لگایا ہے اور اس طرح ایک ایسا مربوط نظامِ فکر ترتیب دیا ہے جو جامع، وسیع، عمیق اور نتیجہ خیز ہے۔ یونان اور روم کے خیالات پر عرب وعجم کی تنقیدات سے یورپ اور امریکہ کے انکشافات و ایجادات تک کا احاطہ کر کے اقبال نے نہایت اہم موضوعات پر انسانی تصورات کی ایک مستند و موثر روداد بہت ہی دلچسپ اور بصیرت افروز انداز سے مرتّب کی ہے''[۳]

اقبال اسلامی تعلیمات کو جدید علوم وفنون کی مدد سے نفسیاتی اور فلسفیانہ طور پر پیش کرنے کی ضرورت پر ہمیشہ زور دیتے رہے۔ ''خطبات'' رقم کرنے کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے آپ کہتے ہیں:

''ان حالات میں (یعنی موجودہ حالات میں) مذہبی حقائق کی سائنٹفک تعبیر قدرتی معلوم ہوتی ہے۔۔۔ان خطبات میں میں نے اسلام کی فلسفیانہ روایات اور انسانی علم کے مختلف شعبوں میں پیش آنے والی حالیہ ترقیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کے مذہبی فلسفہ کی تشکیل جدید کی جُزوی طور پر کوشش کی ہے۔ موجودہ دور اس کام کے لئے بالکل سازگار ہے''[۴]

درحقیقت اقبال مغربی تہذیب وتمدن کے بڑھتے ہوئے اثر ونفوذ کو روکنے کے لئے جدید ذرائع و وسائل کی ضرورت کو شدّت سے محسوس کرتے تھے۔ اس لئے انہیں اس حقیقت کا

زبردست احساس رہا ہے کہ اسلام چونکہ ایک انقلابی تحریک ہے لہٰذا یہ تمام نظام حیات پر ہر زمان ومکان کے مطابق قابلِ عمل ہے۔ لیکن برسوں کے جمود وانجماد نے مسلمانوں کے قلوب کو مضمحل کیا ہے اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلام کو جدید فکر ونظر میں پیش کیا جائے تاکہ ایک اور بار یہ سسکتی ہوئی انسانیت کے دل ودماغ کو اس کی ضیاپاشی سے منور کردے۔ اسی لئے آپ تقلید وجمود کے بجائے اجتہاد پر زور دیتے رہے تاہم ان کی یہ پیش رفت سست اور دھیمی پڑی۔ اس کا ایک بڑا سبب قدامت پسند طبقے کا خوف اور عدمِ اعتماد ہے جو اجتہاد کے بجائے تقلید کو بہتر سمجھتا ہے۔ ۵

علامہ اقبال اجتہاد کے بارے میں بے حد سنجیدہ، محتاط فکر ونظر اور حزم واحتیاط سے سوچ بچار کرتے رہے بالآخر آپ نے لاہور میں ۱۹۲۴ء میں انتہائی نازک موقعہ پر اپنا خطبۂ اجتہاد پیش کیا جب کہ تنسیخ خلافت کے واقعہ کو ابھی صرف چھ ماہ ہوئے تھے۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لئے تنسیخ خلافت کا صدمہ ناقابل برداشت تھا۔ تحریک خلافت بھی ابھی جاری تھی۔ ان حالات میں تنسیخ خلافت کی حمایت اور اسے اجتہادی عمل قرار دینا اقبال کی اولوالعزمی کا اظہار ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ دراصل اُس ساری صورتِ حال کو پوری طرح سمجھنے کے لئے اُس وقت کے سیاسی اور تاریخی پسِ منظر کو مدنظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔

مصطفٰے کمال اتاترک نے جب ''خلافتِ اسلامیہ'' کا ادارہ جو ''خلافت عثمانیہ'' کے لقب سے ملقب تھا، ختم کردیا تو اقبالؒ نے بھی اولین ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا

پھر حسبِ عادت اور اپنی طبعی توازن پسندی کے تقاضے سے سوچا کہ ان احوال میں، جن سے مسلمان اس وقت دوچار تھے، اور ممکن بھی کیا تھا۔ لہٰذا انہوں نے بھی اس وقت یہی مناسب سمجھا کہ پہلے مسلمان ممالک غلامی سے نجات حاصل کریں اور اپنے اپنے علاقوں میں اپنے

پاؤں پر کھڑے ہونے کی اہلیت پیدا کریں، اس کے بعد اسلامی کامن ویلتھ قسم کی کوئی شئے وجود میں آ سکے گی۔ اسی لئے علامہ اقبال نے ترکوں کے ''تجدّد'' کو اس وقت نیک فال جانا اور چاہا کہ دیگر مسلم معاشرے بھی اپنے اپنے سرمایۂ فقہ و اجتہاد کو کھنگالیں۔ سعید اکبر آبادی اقبال کے اس رویئے کے متعلق بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''علامہ صرف مسلمانوں کا نہیں بلکہ دنیا کے تمام انسانوں کا درد و غم اپنے دل میں رکھتے تھے۔ اس بناء پر جب وہ دیکھتے تھے کہ اقوام شرق و غرب سب پر ایک قسم کا سکونِ مرگ طاری ہے تو طبعی طور پر ان کو بڑا صدمہ اور رنج ہوتا تھا''[۶]

یہی وجہ ہے کہ جب اقبال نے ترکی میں جمود اور سکونِ مرگ کے برخلاف انقلاب اور تبدیلی کے آثار دیکھے تو اس پر خوش ہو گئے کہ چلو حرکت و عمل کا آغاز تو ہو گیا۔ وہ غلط عمل کو بے عملی پر ترجیح دیتے تھے۔ کیونکہ بے عملی میں موت مضمر ہے اسی لئے فرمایا ہے

گر از دست تو کارِ نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است

جب یورپ میں فاشزم کی ایک حرکت مسولینی کی شکل میں پیدا ہوئی اور سنٹرل ایشیا میں کمیونزم اور سوشلزم کا دھما کہ انقلابِ روس کی صورت میں پیدا ہوا تو اقبال ادھر بھی متوجہ ہو گئے اور اسے بہ نظر استحسان دیکھنے لگے لیکن اُن کا یہ فوری تاثر ہوتا تھا۔ سعید اکبر آبادی اس بارے میں بھی بحث جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

''وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ جب یہ (انقلابی) تحریکیں اپنے مضمرات اور مقاصد کے ساتھ آگے بڑھتیں اور اپنے اصل رنگ و روپ میں نمایاں ہوتیں تو علامہ تنقید کے نشتر سے ان پر عمل جراحی کرتے اور ان کا کھرا کھوٹا سب دنیا کے سامنے پیش کر دیتے۔ پس یہی معاملہ ترکی میں ضیا کی شاعری اور کمال اتاترک

کی اصلاحات کے ساتھ پیش آیا۔ اس لئے کسی تحریک سے متعلق علامہ اقبال کی اصل رائے وہ ہے جو اس تحریک کے نشیب و فراز کو جانچنے اور پرکھنے کے بعد بالکل اخیر میں ظاہر کی ہے نہ کہ وہ جس کا اظہار تحریک کے بالکل آغاز میں کیا ہے''۷

ترکی انقلاب کی مذمت کیوں؟

مصطفٰے کمال اتاترک سے اقبال نے جو امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں وہ پوری نہ ہوئیں کیونکہ اس نے قدم قدم پر مغربی تہذیب و تمدن کی اندھی تقلید جاری رکھی جس سے اسلامی اقدار پر شدید ضربیں پڑ گئیں۔ اقبال اس وجہ سے اُن سے زبردست بددل ہو گئے اور انہوں نے ''جاوید نامہ''، ''بالِ جبریل'' اور ''ضربِ کلیم'' وغیرہ میں ان کی زبردست مذمت کی۔ چنانچہ ''ضربِ کلیم'' میں آپ مصطفٰے کمال کو تجلیِ افرنگ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

ترا وجود سراپا تجلّیِ افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکر خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

دوسری جگہ اتاترک کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں

لادینی و لاطینی کس پیچ میں اُلجھا تو
داروہے ضعیفوں کا لا غالب الاّ ھو

۱۹۳۱ء میں اقبال ''جاوید نامہ'' میں سعید حلیم پاشا کی زبانی فرماتے ہیں کہ اگر ترکی کے لات و منات افرنگ سے آئیں تو کعبے کے لئے رختِ حیات نیا نہیں بن جائے گا کیونکہ ترکوں کی

تازہ تہذیب کی جدّتیں تو افرنگ ہی کی پرانی باتیں ہیں۔

تو نہ گردد کعبہ را رختِ حیات
گر ز افرنگ آیدش لات و منات
ترک را آہنگ نو درچنگ نیست
تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست

علامہ اقبالؒ نے ترکوں کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ اپنی تہذیب چھوڑ کر مغرب کے فسوں میں غرق نہ ہو جاؤ، اگر مسلمانوں کی طرح جگر رکھتے ہو تو اپنے ضمیر پر نظر ڈالو اور قرآن کریم کی تعلیمات پر نظر رکھو۔

چوں مسلمانان اگر داری جگر
در ضمیر خویش و در قرآن نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست[9]

دراصل تُرکی نے اتحادیون کے پنجے سے چھوٹ کر مغرب کی کورانہ تقلید کی اور ناعاقبت اندیشانہ اصلاحات کو رواج دیا جس سے پورے عالم اسلامی کو زبردست دھچکا لگا لہٰذا اقبال نے ان اصلاحات سے آخر کار یہی اندازہ کیا کہ روحِ مشرق ابھی بدن کی تلاش میں ہی سرگرداں ہے اس لئے آپ پکار اٹھے۔

مری نوا سے گریبانِ لالہ چاک ہوا
نسیم صبح چمن کی تلاش میں ہے ابھی
نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دارو رسن کی تلاش میں ہے ابھی

ایک فکری خلاء

علامہ اقبالؒ کے اخلاص و عمل اور تجدید و احیاء دین کے عملِ صالح کے بارے میں جہاں مکمل اطمینان و ایقان حاصل ہوتا ہے وہیں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اسلامی نظامِ حیات جس کی بقاء کے لئے وہ ساری عمر تڑپتے رہے اور نفاذِ کتاب وسنت جوان کی زندگی کا ماحصل تھا، اس کی ترتیب نفاذ اور تدبیر کار میں ان کے ہاں ایک فکری خلا دکھائی دیتا ہے۔ وہ فکری خلاء کس نوعیت کا تھا اسے متعین کرنا یہاں نہایت ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس کے بغیر ان کے تجدیدی کارنامے کا جائزہ لینا ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں سید اسعد گیلانی مدلّل انداز میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اگر کوئی محقق (researcher) یہ بات کہے کہ ان کے افکار (یعنی علامہ اقبال کے افکار) میں عدم مطابقت (inconsistency) پائی جاتی ہے تو اس سے اختلاف کیا جائے گا، البتہ فکری ارتقاء کا ایک مسلسل عمل ان کے فکری سفر میں موجود ہے۔ وہی ارتقائی عمل جو تارے کو رب قرار دینے، پھر چاند پر ٹھہرنے اور پھر سورج پر رُک کر یہ کہنے سے سامنے آتا ہے کہ ''یہ بڑا ہے یہی میرا رب ہے'' اور جب وہ بھی ڈوب جائے تو پکارنے والا پکار اٹھے کہ میں فنا پذیر چیزوں کا پرستار اور متوالا نہیں ہوں، میرا رب تو وہی ہے جو ان سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ اقبالؒ بھی اپنے افکار کی دنیا میں مسلسل سفر کرتا رہا ہے اور اس کا یہ سفر تلاش و جستجو اور حقیقی منزل تک پہنچنے کا سفر ہے۔ چونکہ وہ روحانی طور پر حضور اکرمؐ کا دامنِ گرفتہ ہے

اس لئے بہت جلد وہ وطنی قومیت اور علاقائی مسلم قومیت کے چیرت کدے سے گذر کر نظریاتی اسلامی قومیت، توحید، کتاب و سنت، رسول اکرمؐ کی قیادتِ انسانیت اور خلفائے راشدین کی مثالی خلافت تک پہنچ جاتا ہے اور پھر اسے انسانی زندگی کی قدیم و جدید ساری الجھنوں کا حل اسی کتاب مبین میں مل جاتا ہے جو انسانوں کے مالک کی طرف سے اس کے بندوں کی طرف ہدایت نامہ اور کتابِ انسانیت بنا کر بھیجی گئی ہے۔ اس طرح اقبالؒ کو وہ محکم بنیاد مل جاتی ہے جس پر قائم رہ کر اس نے وہ کارنامہ سرانجام دیا ہے جسے ہم جزوی طور پر تجدید و احیاءِ دین کا کارنامہ قرار دے سکتے ہیں''[10]

غرض علامہ اقبالؒ احوالِ زمانہ کے ساتھ قدم بہ قدم آگے بڑھتے رہے، رُکے نہیں، اسی لئے ان کا تصورِ اجتہاد خود اجتہاد ہی کی طرح ارتقا پسند اور ارتقا پذیر رہا۔ لہٰذا ہمیں تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کی روشنی میں دور مابعد کے مکتوبات، بیانات، خطبات اور تصریحات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اقبالؒ کی سوچ ۱۹۲۹ء تک پہنچ کے رُک نہ گئی تھی بلکہ ''فکرِ اقبال''، ''تشکیل جدید'' کے بعد ایک مستقل کتاب کا تقاضا کرنے والا عنوان ہے۔ ان کا ہرگز یہ خیال نہیں تھا کہ افکار اسلامی کے متعلق انہوں نے جو خیالات خطبات میں ظاہر کئے تھے وہ حرفِ آخر ہیں۔ بلکہ آپ نے واشگاف الفاظ میں کہا ہے۔

''میں نے عصر حاضر کی ذہنی اور فکری استعداد کے مطابق اسلام کو سمجھانے کی کوشش کی ہے فکر انسانی مسلسل ارتقاء پذیر ہے اس لئے آئندہ اسلام کی تعبیر اور اس کی تشریح و توضیح کے لئے نئے نئے پیراہائے بیان پیدا ہوں گے۔ اس لئے مسلمانوں کو فکر انسانی کی ترقی پذیری کی اس رفتار پر نگاہ رکھنی چاہیے تاکہ وہ آئندہ بھی عصر نو کی زبان میں اسلام کی تشریح کا فریضہ انجام دے سکیں''[11]

تدوین فقہ جدید وقت کی اہم ترین ضرورت

اقبالؒ کے نزدیک تدوین فقہ جدید وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ یہی آرزو اُن کی زندگی میں ان کے دل کی دھڑکن بن گئی تھی۔ اس عظیم ملی ضرورت کے لئے آپ مسلسل اور پیہم کوشاں رہے۔ آپ کے خیال میں ہر دور میں اسلامی نظام قانون میں ارتقاء کا عمل جاری رہا ہے۔ یہ عمل خلافتِ راشدہ کے دور سے لیکر اورنگ زیب عالمگیر کے دور تک کسی نہ کسی طرح تدریجی ارتقائی مراحل سے گذرتا رہا ہے۔ علمائے فقہا نے اس اہم ترین کام کو ہر دور میں سر انجام دیا ہے البتہ جب سے ہند میں علمی اور اسلامی میخانے (ادارے) بند ہوئے اسی وقت سے اسلامی قانون کے ارتقاء کا عمل رک کر ایک خلأ پیدا کر گئے۔ انہی عوامل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ کہتے ہیں

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے تیرا فیض ہو عام اے ساقی

اقبالؒ کے نزدیک تین سو سال کے ارتقائی عمل کے خلأ کو پُر کرنے کی ایک تدبیر یہ ہے کہ ایک مجلس قانون ساز بیٹھے جو اپنی فکری کوششوں سے اس خلأ کو پُر کر دے۔ یہی مجلسِ قانون ساز جدید ریاست کی جدید ضروریات کے مطابق قانونِ اسلامی کو مرتب و مدّون کرے اور موجودہ حالات میں اسے عدالتوں میں نفاذ کے قابل بنانے کے لئے دفعہ وار (codify) ترتیب دے۔ اس ضمن میں آپ نے واضح طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے۔

> ''موجودہ دور میں اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی تدوین جدید ہے تاکہ زندگی کے ان سینکڑوں، ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا جائے جن کو موجودہ قومی اور بین الاقوامی، سیاسی، معاشی اور سماجی ارتقاء نے پیدا کیا ہے''[۱۲]

آپ نے ۱۹۳۳ء میں ایک تقریر کے دوران کہا:

''میں علماء کی اسمبلی کے قیام کا مشورہ دوں گا جس میں مسلمان وکلاً بھی شامل ہوں جو فقہ سے واقف ہوں۔ اس کا مقصد اسلام کی حفاظت اور تجدید ہے اس طور پر کہ بنیادی اصولوں کی رُوح قائم رہے۔ اس جماعت کو دستوری سند حاصل ہوتا کہ کوئی قانون جو مسلمانوں کے پرسنل لاً پر اثر انداز ہوتا ہو، اس اسمبلی کے بغیر قانون نہ بن سکے۔ اس تجویز کے عملی فائدے کے علاوہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ زمانۂ حاضر کو بھی اسلام کے قانونی ادب کی بیش بہا قیمت کا اندازہ نہیں ہے''۔[۱۳]

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے خیالات بھی عصرِ حاضر میں تدوین فقہ جدید کے متعلق کم و بیش اقبال ہی کے خیالات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ آپ بھی عصر جدید میں اسلامی قانونی اکیڈمی کے قیام پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''ایک قانونی اکیڈمی قائم کی جائے جو اس پورے کام کا جائزہ لے جو علم قانون میں ہمارے اسلاف اس سے پہلے کر چکے ہیں اور ان ضروری کتابوں کو جو ہمارے فقہ اسلامی کی واقفیت کے لئے ناگزیر ہیں اردو زبان میں صرف منتقل ہی نہ کرے بلکہ ان کے مواد کا زمانۂ حال کے طرز ترتیب کے مطابق مرتب بھی کر دے تا کہ ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جا سکے''۔[۱۴]

تدوین احکام کے ضمن میں بھی بحث کرتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ علامہ اقبالؒ کے خیال کے عین مطابق عالم اسلامی کو یہی مشورہ دیتے ہیں:

''ذمہ دار علماء اور ماہرین قانون کی ایک مجلس مقرر کی جائے جو اسلام کے قانونی احکام کو جدید دور کی کتب قانونی کے طرز پر دفعہ وار مدوّن (codify) کرے''۔[۱۵]

اس کے علاوہ آپ تعلیم قانون کے نصاب میں تین مضامین شامل کرنے پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک جدید زمانے کے اصولِ قانون (jurisprudence) کے ساتھ ساتھ اصولِ فقہ کا مطالعہ، دوسرے اسلامی فقہ کی تاریخ کا مطالعہ، تیسرے فقہ کے تمام بڑے بڑے مذاہب (اسکولوں) کا غیر متعصّبانہ مطالعہ کیا جانا چاہیئے۔

اجماع اور قیاس کی تشکیل نو

علامہ اقبالؒ کے نزدیک دورِ حاضر کے مسائل اتنے متنوع ہیں کہ ان کا حل ایک عالم یا مفتی کے بس کی بات نہیں بلکہ محض دینی علوم کا علم بھی کافی نہیں۔ آج کے مسائل کے حل کے لئے معاشیات، طبیعات، قانون، نفسیات، انجینئرنگ وغیرہ کا علم بھی ضروری ہے۔ ایک ہی شخص ان تمام علوم کا ماہر نہیں ہوسکتا، اس لئے مختلف علوم کے ماہرین کی شمولیت ضروری ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک اجتہاد اور اجماع دونوں کو اکٹھا کرنے کی ضرورت ہے۔ اجتہاد انفرادی کے بجائے اجتماعی ہو اور اس کے لئے ادارے قائم کئے جائیں۔

علامہ اقبالؒ نے اجماع اور قیاس دونوں کی تشکیل نو پیش کی۔ اجماع کو آپ نے مصدر کی بجائے طریقہ اجتہاد اور اصول کے طور پر پیش کیا۔ اجماع کی روایتی تعریف میں اجماع کی تمام ذمہ داری علماء کی ہے۔ ان کے نزدیک دورِ حاضر میں اجماع کا مطلب ایسا ادارہ ہے جس میں علماء دوسرے لوگوں کے ساتھ مل بیٹھ کر مسائل پر غور وفکر کریں اور اتفاق رائے سے مسائل کا حل تلاش کریں۔ یہاں اقبالؒ علماء کی امتیازی حیثیت یا فقہی ولایت کے قائل نظر نہیں آتے۔ اجماع کی یہ حیثیت صرف اجماع صحابہ کو دی جاسکتی ہے۔ دورِ حاضر میں اقبالؒ کے نزدیک قانون ساز اسمبلیاں اجماع کے ادارے کا کام کرسکتی ہیں۔[۱۶]

علامہ اقبالؒ کی رائے سے ملتی جلتی رائے دورِ جدید کے اہم اسلامی دینیات کے ماہر

محمد تقی امینی کی بھی ہے۔ آپ فقہاء کے بجائے ''اہل حل وعقد'' کہتے ہوئے ایسے اہل بصیرت و تجربہ کار لوگوں کی طرف اشارہ دیتے ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہوئے اس قانون سازیہ کے معاون بن سکتے ہیں چنانچہ آپ اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> ''اجماع کی اصل اور ممکن العمل صورت یہی ہے کہ قانونی معاملات میں ''اہل حل وعقد کی ایک مجلس مشاورت قائم ہو اور حالات ومسائل کے غور وفکر کے بعد اس کا صحیح حل تجویز کرے۔ جو کہ ایک طرف کتاب وسنت کے خلاف نہ ہو اور دوسری طرف ضروریاتِ زندگی سے ہم آہنگی پیدا کرنے والا بھی ہو۔''[۱۷]

آپ کے اس اقتباس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ آیا مجلسِ مشاورت سے مراد پارلیمنٹ ہے یا مجلسِ قانون یا محض اہل حل وعقد کی ایک جمعیت جو مشورے پیش کرتی رہے۔ یہ ابھی واضح نہیں ہے کہ ''اہل حل وعقد'' سے اُن کی کیا مراد ہے، یعنی وہ لوگ کن اوصافِ حمیدہ کے مالک ہونے چاہیں اور علم ودین سے اُن کی آگہی کا درجہ کیا ہوگا۔ یہ جملہ مسائل ان کے یہاں تشنۂ تشریح ہیں جبکہ علامہ اقبالؒ نے اس بارے میں وسیع القواعد سے اصول بتائے ہیں جن میں کسر وانکساری کی گنجائش بالکل واضح ہے تاکہ عملی مشکلات کو ان اصولوں کی روح کے مطابق حل کیا جاسکے۔ اسی لئے آپ محدود عرصے کے لئے علماء اور اسکالرس کا باضابطہ بورڈ تشکیل دینے کے حق میں ہیں جو براہِ راست دینی مسائل ومعاملات سے تعلق رکھنے والے امور پر صلاح مشورے سے رائے زنی کریں۔ اقبالؒ کے اس ''اجتماعی اجتہاد'' کی تائید عالم اسلام کے ایک مشہور جدید فقہی عالم استاذ ابوزہرہ کے خیالات سے بھی ہوتی ہے دونوں میں صرف اتنی فرق دکھائی دیتی ہے کہ اقبال ''اجتماعی اجتہاد'' کو موجودہ پارلیمانی ایوان کی صورت دینا چاہتے ہیں اور ابوزہرہ اس کو ذرا وسیع کرتے ہوئے پوری اُمّت مسلمہ کے لئے ایک ایسی

اکیڈمی میں تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں جو اکیڈمی بالکل اسی طرز کی ہونی چاہیئے جیسے ہمارے ہاں آج کل کی لسانی اور سائنسی اکیڈمیاں ہیں وہ ایک فقہی اکیڈمی قائم کرنے کا مشورہ دیتے ہیں جس میں ایسے بلند پایہ فقہاء ہر اسلامی ملک سے چُنے جائیں جو موجودہ مروّجہ علوم سے بھی پوری طرح واقف ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ تقویٰ میں بھی اعلیٰ معیار کے متحمل ہوں۔ان خیالات کا ذکر آپ اپنی عربی تحریر ''الاجتهاد فی الفقة الاسلامیه'' میں یوں کرتے ہیں:

ان یوسس مجمع للفقة الاسلامی علیٰ طریقة المجامع العلمیة واللغویة (الاکادیمیات) ویضم هذا المجمع من بلد اسلامی اشهر فقهائه الراسخین ممن جمعوا من العلم الشرعی والاستنا ره الزمنیة وصلاح السیرة والتقویٰ[18]

یعنی اس کا اسلوب عمل یہ ہو کہ فقہ اسلامی کے لئے بھی ایک ایسی اکاڈمی بنائی جائے جیسے سائنسی اور لسانی اکادمیاں ہیں۔اس اکادمی میں ہر اسلامی ملک کے معروف فقہائے راسخین شامل ہوں جن کی ذات میں شرعی علم،عصری روشنی،حسن سیرت اور تقویٰ جمع ہوں۔

علامہ اقبالؒ کے خیال کے عین مطابق استاذ ابوزہرہ کے علاوہ دوسرے معاصر علماء نے بھی دورِ جدید کے مقتضیات کے تحت اجتماعی اجتہاد اور اجتماعی فقہی اکیڈمیوں کے قیام پر زور دیا ہے۔ان میں شیخ عبدالوہاب خلاف[19]، شیخ محمود شلتوت[20]، شیخ مصطفیٰ الرزقا[21]، شیخ طاہر بن عاشورہ[22] اور ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ یہاں تک فرماتے ہیں:

''ہمارے لئے ضروری ہے کہ عربی زبان وادب کے ساتھ اسلامی فقہ اور اس کی توضیح وتشریح کے لئے ایک اکیڈمی ہو کیونکہ عربی اکیڈمی تو زبان وادب کی بیش

بہا خدمات انجام دے رہی ہے لیکن فقہ اکیڈمی کی ضروریات زیادہ شدید ہے اس لئے کہ پیش آمدہ مسائل میں قرآن وسنت کی رہنمائی تلاش کرنا زبان کے مسائل سے زیادہ تنوع اور تراکیبیں رکھتا ہے۔ لیکن کسی فرد واحد یا متعدد افراد سے جو مختلف موضوعات پر اپنے طور سے کام کررہے ہیں یہ کام انجام نہیں پاسکتا۔ لہٰذا ایک ایسی اکیڈمی کی ضرورت ہے جو ہر سال پیش آمدہ مسائل پر علماء کو دعوتِ تحقیق دے اور ہر موضوع کا ماہر اپنے موضوع کے اعتبار سے اس کی تفصیلات کا مطالعہ کرے۔ پھر اجتماعی طور پر ہر سال مذاکرہ ہو جس میں ہر فرد اپنے خیالات ونتائجِ تحقیق پیش کرے۔ پھر اجتماعی قرارداد منظور کی جائے اور اس کی بنیاد پر شرعی حکم کا نفاذ ہو جس پر عمل کرنا مسلمانوں کے لئے ضروری ہو، میرے نزدیک اسی عمل کا نام اجماع ہے''[۲۳]

متعدد علماء عصر نے اقبالؒ کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے اجتماعی اجتہاد کے لئے دورِ حاضر میں علمی ولسانی اکیڈمیوں کے طرز پر فقہ اسلامی کی ایک انٹرنیشنل (مسلم) اکیڈمی قائم کرنے پر زبردست زور دیا ہے جس میں عالم اسلام کے مشہور اور راسخ علماء کی خدمات حاصل کی جائیں اور اس کا نام ''الفقة الاسلامی العالمی'' (عالمی فقہ اکیڈمی) ہو۔[۲۴] یہی عالمی فقہ اکیڈمی ان گوناگوں مسائل کا اسلامی حل تلاش کرسکتی ہے جو امت مسلمہ کو آج کل درپیش ہیں۔ اسی جذبے کے تحت ۱۹۷۶ء میں ''رابطہ عالم اسلامی'' نے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے اسلامی فقہ اکیڈمی قائم کی۔ یورپ اور مسلم دنیا کی متعدد فقہ اکیڈمیاں اس سے وابستہ ہوئیں اور اس کی کونسل اپنے سالانہ اجتماعات میں مسلمانوں سے متعلق فقہی امور میں جو فیصلے کرتی ہے بالعموم انہیں حتمی تسلیم کرلیا جاتا ہے۔

''قیاس'' کے متعلق اقبالؒ اور معاصر علماء کا نقطہ نظر:

قیاس (Analogy) کا مسئلہ تو علامہ اقبالؒ کے نزدیک قانون سازی میں مماثلتوں کی بنا پر استدلال سے کام لینا ہے۔ اس مسئلہ کے بارے میں اقبالؒ بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں بھی فقہا نے یونانی منطق کو اسلامی طریق استنباط پر فوقیت دے دی۔ اس لئے آپ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اجتہاد میں استخراجی کی بجائے استقرائی منطق اور مقاصد شریعت پر توجہ مرکوز کی جائے۔ اپنے چھٹے خطبے ''الاجتہاد فی الاسلام'' میں اقبال اپنے زمانے کی خواتین کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تقلید اور قیاس کی پابندی کی وجہ سے خود دین اسلام پر زد پڑ رہی تھی مثلاً لاپتہ خاوند کی بیوی کو حنفی فقہا پچاس سال تک انتظار کراتے تھے۔ خاوند مار پیٹ کرے، نان ونفقہ روک لے یا دوسرے طریقوں سے بیوی پر ستم ڈھائے تو حنفی فقہ کے مطابق بیوی کو عدالت میں جانے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ان سخت قوانین سے تنگ آ کر مسلمان عورتوں نے شوہروں کے ظلم وستم سے آزادی حاصل کرنے کے لئے یہ حیلہ اختیار کیا کہ وہ عدالتوں میں حاضر ہو کر ترک مذہب کا اعلان کرتیں اور تنسیخ نکاح کا دعویٰ کر کے شوہر سے آزاد ہو جاتیں۔ ان میں اکثر بعد میں دوبارہ مسلمان ہو جاتیں لیکن اس سے ارتداد کا فتنہ شروع ہوا۔ چنانچہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی یعنی ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۵ء تک عدالت میں ایسے مقدمات کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ مسلمان عورتوں نے تنسیخ نکاح کے لئے عیسائی ہونے کا دعویٰ کیا۔ ان حالات میں علامہ اقبالؒ ہی نے سب سے پہلے عالم اسلام کو اس جانب توجہ دلائی۔ آپ نے واضح کیا کہ مذہب، عقل، نسل اور جان و مال کی حفاظت تو اسلامی قانون کے مقاصد میں سے ہے لہٰذا اگر فقہ اسلامی نے مظلوموں کی دادرسی نہیں کی تو لوگ مذہب سے برگشتہ ہو کر کوئی اور راہ اپنا لینے پر مجبور ہوں گے۔[۲۵]

انہی عوامل کے پیش نظر علامہ اقبالؒ قیاس کی جگہ مقاصد شریعت کے استدلال کی

ضرورت پر زور دیتے ہیں تا کہ درج بالا اور دیگر مسائل آسانی سے حل کئے جاسکیں۔ اگر چہ علامہ کو ان مسائل کے ابھارنے پر مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن اسی سے بحث وتمحیص کا دروازہ کھل گیا اور عورتوں کے مسائل پر گفتگو کا آغاز ہو گیا۔ علماء وفقہا اس طرف متوجہ ہوئے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بعض دوسرے علماء کو اس جانب توجہ دلائی۔ حرمین شریفین کے علماء دین سے خط وکتابت کی۔ فقہ حنفی کے علاوہ دوسرے مذاہب فقہ کی آراء کا جائزہ لیا اور پھر تحقیق و تفتیش کے بعد ایک جامع و مانع تحریر ''الحیلة الناجزه للحلية العاجزه '' کے نام سے منظر عام پر لائی جو درحقیقت علمائے دیوبند کی ایک مجلس کا اجتہاد ہے۔ اس میں لاپتہ خاوند، نان و نفقہ کی تنگی، شوہر کی مار پیٹ اور ظلم وستم وغیرہ مسائل پر عورتوں کو عدالت میں جانے کا حق تجویز کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تجویز کیا گیا کہ شوہر بیوی کو طلاق کا حق تفویض کر سکتا ہے اور جب حالات نا قابل برداشت ہو جائیں تو بیوی اس حق کو استعمال کرتے ہوئے شوہر کو طلاق دے سکتی ہے۔ اسی تحریری اجتہاد کو بنیاد بنا کر مسلمانانِ ہند نے ایک شریعت بل قانون ساز اسمبلی کو پیش کی جو بالآخر ۱۹۳۹ء میں تنسیخ نکاح کے ایکٹ کی صورت میں منظور ہو گیا۔ بیسویں صدی میں اجتہاد اور اس کی بنیاد پر قانون سازی کی یہ ایک اہم مثال تھی۔[۲۶] اول تو اس میں واقعتاً پیش آمدہ مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ علامہ اقبالؒ اسی حل کے لئے قیاس کے بجائے مقاصد شریعت سے استدلال پر زور دیتے ہیں۔

دوسرے، علماء کی جماعت نے اس اجتہاد میں برابر شرکت کی۔ یہ اجتہاد فی المذہب نہیں تھا یعنی صرف حنفی مذہب ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ دوسرے مذاہب کی آراء پر عمل کا فتویٰ دیا گیا۔ تیسرے، یہ اجتہاد باقاعدہ قانون سازی کے عمل سے گذر کر قانون بنا۔ چوتھے، یہ قانون ایک غیر مسلم حکومت کی منظوری سے جاری ہوا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ دورِ استعمار میں بھی اجتہاد کا عمل جاری رہا ہے۔

مختلف تحقیقاتی ادارے

آزادی کے بعد مسلم ممالک کو جو مسائل درپیش رہے، ان میں طرزِ حکومت، معاش اور معاشی استحکام، قانون سازی اور تعلیم وغیرہ کے بنیادی مسائل کا سامنا کرنا پڑا، ان میدانوں میں بھی انقلابی اقدامات اور اجتہادات کی ضرورت تھی۔ اسی ضرورت کے تحت پاکستان میں بھی کئی تحقیقی ادارے قائم کئے گئے۔ کراچی میں مرکزی ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی ۱۹۶۰ء میں قائم کیا گیا جو اب ادارۂ تحقیقات اسلامی کے نام سے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ لاہور میں بھی ادارۂ ثقافت اسلامیہ، اور اقبال اکیڈمی قائم کی گئی۔ جہاں پر علوم اسلامی اور اقبالیات پر تحقیق کا کام شدومد سے جاری ہے۔ اسی طرح مشرقی پاکستان میں اسلامی اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی مشاورتی کونسل قائم کی گئی جو اب اسلامی نظریاتی کونسل کے نام سے کام کر رہی ہے۔ ان اداروں نے تحقیقی اور اشاعتی منصوبوں کے ساتھ ساتھ بیشتر ملکی اور بین الاقوامی مسائل پر بھی اجتہادات پیش کئے۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ نے خلیفہ عبدالحکیم کی قیادت میں معاشی، سیاسی اور قانونی مسائل پر تحقیقات شائع کیں۔ خلیفہ عبدالحکیم نے خود بھی ان مسائل پر خامہ فرسائی کی اور قانون سازیہ میں برابر حصہ لیتے رہے۔[۲۷] اس طرح انہوں نے علامہ اقبال کے فقہ جدید کے ادھورے خواب کو آگے لیجانے میں اہم حصہ ادا کیا۔ آج کل اس ادارے کے سربراہ ڈاکٹر رشید احمد جالندھری ہیں، جن کی ذات میں مشرق ومغرب یعنی جامعہ الازہر اور کیمبرج یونیورسٹی کی علمی روایات جمع ہیں۔ ان کی سربراہی میں یہ ادارہ کافی فعال بن گیا ہے۔ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی اور اسلامی نظریاتی کونسل نے بھی اجتہادی پیش رفت میں حصہ لیا۔

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (جامعہ ملیہ اسلامیہ) دہلی کے اہتمام سے دسمبر ۷۶ء کے اواخر میں ایک اعلیٰ پایہ کا سمینار منعقد کیا گیا جس میں اجتہاد اور اقبال کے

حوالے سے کم وبیش دس مقالے پڑھے گئے اور جولائی ۱۹۷۸ء میں مرحوم مشیر الحق اور ضیاء الحسن فاروقی کے اہتمام سے ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید'' کے عنوان کے تحت یہ مقالات کتابی صورت میں چھپ گئے۔

کچھ مدّت پہلے انسٹی ٹیوٹ آف انجیکٹیو سٹیڈیز نئی دہلی کی طرف سے بھی ''اجتہاد'' کے وسیع موضوع پر سمینار منعقد کیا گیا اور پھر مستند اور سربرآوردہ دانشوروں کے پڑھے گئے یہ مقالات ۱۹۹۸ء میں ''اجتہاد اور مسائل اجتہاد'' کے نام زیورِطباعت سے آراستہ کئے گئے۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سرینگر نے بھی علامہ اقبال کے بارے میں اپنے قیام سے لیکر اب تک قابل قدر تحقیقی اور تنقیدی کام سرانجام دیا ہے۔ اس ادارے کا آغاز پروفیسر آل احمد سرور (مرحوم) کے ہاتھوں ہوا اور اس وقت اس کے سربراہ ڈاکٹر بشیر احمد نحوی ہیں۔ یہ ادارہ خالص علمی اور تحقیقی نوعیت کے کام سرانجام دیتا ہے۔ اس شعبے میں اقبال کے فکر وفلسفہ اور شاعری کے حوالے سے اس وقت تک بائیس ایم فل اور گیارہ پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جا چکے ہیں اور تحقیقی عمل برابر جاری وساری ہے۔

اقبال کے فکر وفن اور فلسفہ کے بارے میں یہ ادارہ مختلف موضوعات پر اب تک تین درجن سے زائد سمینار منعقد کرا چکا ہے اور تقریباً تیس ماہرین اقبالیات نے توسیعی خطبات پیش کئے ہیں۔ اس کی مطبوعات کی تعداد ساٹھ تک پہنچ چکی ہے۔ اس ادارے کا کتب خانہ اقبال سے متعلق برصغیر کا اہم کتب خانہ ہے جہاں تقریباً دس ہزار کتب اور رسائل موجود ہیں۔ اقبال کا عرفان عام کرنے اقبال کے سلسلے میں ماضی کے تجزیئے، حال کی تفہیم اور مستقبل کے منصوبوں کو ان کے فکر وفلسفہ کی روشنی میں عملی کام کرنے کی جانب اس ادارے کی کاوشیں قابل قدر ہیں۔

اجتماعی اجتہاد کی عملی ترویج

علامہ اقبالؒ کی دعوتِ اجتہاد سے بیسویں صدی میں اجتہاد کا عمل کافی تیز رہا۔ جس میں علماء اور مدارس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس ضمن میں ایک اہم پیش رفت دارالافتاء کا قیام ہے۔ تقریباً ہر دینی مدرسے میں دارالافتاء قائم کیا گیا ہے جہاں فتاویٰ کا باقاعدہ اندراج ہوتا ہے۔ ان کے جوابات دیئے جاتے ہیں اور پھر مجموعوں کی شکل میں چھپنا شروع ہوتے ہیں۔ تقریباً تمام اسلامی ممالک میں اب فتاویٰ کے ادارے قائم کئے گئے ہیں اور وہاں سے اب باضابطہ طور پر فتاویٰ کے مجموعے شائع ہوتے ہیں۔ جامعہ الازہر کا ''الفتاویٰ الاسلامیہ'' تیرہ سے زیادہ جلدوں میں چھپ چکا ہے۔ بیسویں صدی کی ایک اور اہم پیش رفت اجتماعی اجتہاد کے ادارے ہیں۔ مثلاً سعودی عرب میں ''المجمع الفقہی'' اور بھارت میں ''اسلامی فقہ اکیڈمی'' جہاں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد امت مسلمہ کو پیش آمدہ مسائل پر علماء اور فقہاء مل بیٹھ کر غور وفکر کر کے اپنی آراء پیش کرتے ہیں۔ ان کی آراء پر مبنی فتاویٰ کے مجموعے شائع کئے جاتے ہیں اور ان کو بنیاد بنا کر جدید فقہی کتابیں بھی ترتیب دی جاتی ہیں۔

عالم اسلام میں ہر جگہ اب اجتماعی اجتہاد کے لئے باضابطہ کام شروع ہو چکا ہے۔ مراکو، سعودی عربیہ اور کویت، تینوں ملکوں میں فقہ کی انسائیکلو پیڈیا مرتب و مدوّن کرنے کا پروگرام ہاتھ میں لیا گیا ہے اور اس کا نام انہوں نے ''الموسعة الفقيهه'' رکھا ہے۔ اس سلسلے میں کویت پیش قدمی کر کے ۲۰ جلدوں میں یہ کام اختتام تک پہنچانے کے قریب ہے۔ اصول فقہ پر سب سے زیادہ اور محققانہ کام مصر میں ہوا ہے۔

عالم اسلام میں بیسویں صدی میں اجتہاد کے ارتقا کا عمومی جائزہ لیتے ہوئے مندرجہ ذیل خصوصیات ممتاز نظر آتی ہیں۔ اول تو اجتماعی اجتہاد کی شکل ابھر کر سامنے آئی ہے۔ دوسرے تحقیق واجتہاد کے وسائل میں بہت پیش رفت ہوئی ہے۔ علوم قرآن، تفسیر، حدیث اور

فقہ کی بہت سی نادر کتابیں جن کے اب تک صرف نام سنے جاتے تھے، اب شائع ہوکر دستیاب ہیں۔ تیسرے تحقیق واجتہاد کے لئے بہت سی امدادی کتابیں سامنے آگئی ہیں جن میں معاجم، اشاریئے اور فہارس وغیرہ شامل ہیں۔ کمپیوٹر نے اس کام کو مزید آسان اور سہل پسند بنادیا ہے۔ اب فقہ کی بنیادی کتابیں سینکڑوں کی تعداد میں سی ڈی روم پر بھی دستیاب ہیں۔ چوتھے، اجتہاد کے رجحانات میں اب مقاصد شریعت سے استنباط کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ اس عصر میں علامہ اقبال نے ہی پہلی مرتبہ اس اصول کی طرف توجہ دلائی۔ اب اس موضوع اور اصول استنباط پر کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

عالم اسلام میں آج جو ہر طرف سے اجتماعی اجتہاد کی اہمیت وافادیت کا احساس بڑھ رہا ہے۔ یہ سب اصل میں اقبالؒ ہی کی کوششوں کا ثمر ہے۔ اس بارے میں سعید اکبر آبادی بجا لکھتے ہیں کہ:

> ''عالم اسلام میں اس وقت اسلامی قوانین کی تدوین جدید کے لئے جتنی انفرادی اور اجتماعی کوششیں ہورہی ہیں، یہ سب دراصل اقبال کے خواب کی تعبیر میں ہیں۔ اس لئے اگر آج وہ زندہ ہوتے تو اس پر مسرور ہونے کا حق ان سے زیادہ اور کسے ہوتا''[۲۸]

ان دِنوں نہ صرف عالم اسلام ہی میں بلکہ پورے کرۂ ارض پر احیائے اسلام کے چرچے ہیں۔ یورپ اور امریکہ تک کے براعظموں میں وہاں کے دانشور حلقے اور رائے عامہ کو منظّم کرنے والے عناصر سوچنے لگے ہیں کہ ایشیا اور امریکہ کے مسلمانوں کو صدیوں تک اپنے استعمار و استبداد کی گرفت میں اسیر رکھنے کے باوجود اسلام کا جذبہ، مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں میں کیوں زوال پذیر نہیں ہوسکا اور یہ چار طرف سے اسلام کے حرکی نظام کے بڑھتے ہوئے قدموں کی دھمک سی کیوں سنائی دے رہی ہے۔ چنانچہ یہ راز معلوم کرنے کے لئے قرآن

وحدیث اسلامی فقہ اور اسلامی تہذیب کا از سرِ نو بیدار ذہنیت سے مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ اب جگہ جگہ اسلامی تحقیقی مراکز قائم ہو رہے ہیں۔ یورپی اور امریکی ممالک میں ہزاروں، لاکھوں افراد اسلام کے اجتہادی نظام سے متاثر ہو رہے ہیں اور الحاد اور بے یقینی اور لامذہبیت کی دُھند اب ان کے دل و دماغ سے نکلتی جا رہی ہے۔ یہی اسلام کی عالمگیریت کے واضح امکان کا ایک بلیغ اشارہ ہے۔

مآخذ

۱۔ سمیع اللہ ''خطباتِ اقبال کا پس منظر'' (مشمولہ) صحیفہ جنوری ۷۴ء، ص ۱۳۲

۲۔ سید وحید الدین ''تفکر اقبال'' ص ۲۷، اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر، مارچ ۱۹۸۷ء

۳۔ عبدالمغنی ''اقبال کا نظریۂ خودی'' ص ۹۷، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۹۰ء

۴۔ محمد اقبال ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' مترجم سید نذیر نیازی، ص ۴۰، اسلامک بک فاؤنڈیشن دہلی ۱۹۹۵ء

۵۔ علامہ اقبالؒ کے اجتہادات پر وقتاً فوقتاً تنقید ہوتی رہی، مثلاً مولانا سید سلیمان ندویؒ اور سید ابوالحسن ندویؒ نے علامہ اقبالؒ کے خطبات کے بارے میں اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ اگر یہ شائع نہ ہوتے تو اچھا ہوتا (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سید ابوالحسن ندوی کی ''روائع اقبال'' کا اردو ترجمہ نقوش اقبال مترجم شمس تبریز کراچی مجلس نشریاتِ اسلام ۱۹۷۳ء ملاحظہ ہو) اس کتاب کے صفحہ ۴۰ نمبر ا میں تحریر ہے کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا کہنا تھا کہ کاش یہ کتاب شائع نہ ہوتی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اصل عربی کتاب یعنی ''روائع اقبال'' کے ۱۹۶۰ء اور ۱۹۸۳ء کے ایڈیشن میں یہ حاشیہ اور عبارت شامل نہیں ہے۔

بہرحال مولانا سید سلیمان ندویؒ کے اس قول پر مولانا سعید اکبر آبادی تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''اگر اس قول کی نسبت ان حضرات کی طرف صحیح ہے تو یہ نہیں معلوم کہ انہوں نے خطبات کا از اول تا آخر توجہ سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے یا کچھ سن سنا کر یا خطبات کی سرسری ورق گردانی کے بعد انہوں نے یہ اظہار خیال کیا ہے۔۔۔۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ ایسی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کے افکار و نظریات اسلامی کی تاریخ پر نظر نہیں ہے۔ فقہ، علم کلام، تفسیر اور فلسفہ و تصوف میں کتنے مکاتبِ فکر پیدا ہوئے اور ان میں بحث و جدال کی کیسی گرم بازاری رہی؟ اسلامیات کا ہر طالب علم اس سے واقف ہے''

(مزید تفصیل کے لئے دیکھئے ''خطبات اقبال پر ایک نظر'' از سعید اکبر آبادی)

۶۔ سعید اکبر آبادی ''خطبات اقبال پر ایک نظر'' ص ۵۴، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سرینگر
۷۔ ایضاً۔۔۔ص ۵۵
۸۔ محمد اقبال ''کلیات جاوید'' ص ۶۶/ ۴۵۴، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء
۹۔ ایضاً۔۔۔
۱۰۔ سعید اسعد گیلانی ''اقبال، دارالاسلام اور مودودیؒ'' ص ۷۰۔۶۹، اسلامی اکادمی، اردو بازار، لاہور، ۱۹۷۸ء
۱۱۔ محمد اقبال ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' مقدمہ از مترجم ص ۳۴۔
۱۲۔ حیات انور، ص ۱۶۰ (مشمولہ) اقبال، دارالاسلام اور مودودی از سید اسعد گیلانی، ص ۳۷۔
۱۳۔ سید اسعد گیلانی، ''اقبال دارالاسلام اور مودودی'' ص ۳۷۔
۱۴۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی ''اسلامی قانون'' ص ۴۸، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، جون ۱۹۸۳ء
۱۵۔ ایضاً۔۔۔ص ۵۳۔
۱۶۔ محمد اقبال ''الاجتہاد فی الاسلام'' (مشمولہ) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ مترجم نذیر نیازی۔
۱۷۔ مولانا محمد تقی امینی ''فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر'' ص ۲۷، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ڈھاکہ، ۱۹۷۵ء
۱۸۔ استاذ ابوزہرہ ''الاجتہاد فی الفقہ الاسلامی'' (مشمولہ) الندوۃ العالمیہ الاسلامیہ، ص ۱۰۹ء، مطبوعہ جامع پنجاب، لاہور، ۱۹۶۵ء
۱۹۔ عبدالوہاب خلاف ''مصادر التشریع الاسلامی فیما لانص فیہ'' طبع دوم دارالقلم کویت، ۱۹۷۰ء ص ۱۳
۲۰۔ شلتوت ''الاسلام عقیدہ و شریعۃ'' کویت ۱۹۷۰ء ص ۵۵۸۔
۲۱۔ الزرقاء ''الاجتہاد'' ص ۱۱۷، بیروت
۲۲۔ محمد الطاہر بن عاشور "مقاصد التشریعۃ الاسلامیہ" طبع اول ۱۹۷۸ء ص ۱۴۰۔۱۴۱۔
۲۳۔ محمد یوسف موسیٰ ''الاسلام والحیاۃ'' مکتبہ وہبۃ قاہرہ، ۱۹۶۱۔ص ۱۸۷۔
۲۴۔ اسی ضرورت کے پیش نظر عالم عرب میں دو قابل ذکر ادارے قائم ہیں۔
(۱) مجمع البحوث الاسلامیہ مصر

(۲)المجمع الفقهی، رابطه العالم اسلامی مکه (دراسات،عمان جلد۱۴،شمارہ۱۰) ۱۹۸۷ء(مشمولہ) سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ مارچ ۱۹۹۴ء۔

۲۵۔ محمد اقبال ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' چھٹا خطبہ،ص ۲۷۷۔

۲۶۔ محمد خالد مسعود ''اقبال کا تصور اجتہاد'' ص ۲۰۳،راولپنڈی،مطبوعات حرمت ۱۹۸۵ء

۲۷۔ پاکستان میں اجتہادی مساعی میں سب سے پہلا نمایاں کام عائلی قوانین کا تھا جو ۱۹۶۲ء میں جاری کئے گئے۔اس قانون سازی میں خلیفہ عبدالحکیم پیش پیش تھے۔ عائلی کمیشن کی سفارشات حکیم صاحب مرحوم کی تیار کردہ ہیں۔ان قوانین میں پہلی بار کسی ایک فقہی مکتب کی تقلید کی بجائے قرآن وسنت کی روشنی میں اجتہاد سے کام لیتے ہوئے عائلی قوانین مرتب کئے گئے۔ یہ اجتہادی سرگرمیاں دراصل اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں جس کا آغاز علامہ اقبال کی دعوت اجتہاد سے ہوا اور جس کے نتیجے میں مولانا تھانویؒ کی اجتہادی تحریک الحیلۃ الناجزہ اور ۱۹۳۹ء کا قانون تنسیخ نکاح ظہور میں آئے تھے۔

۲۸۔ سعید اکبر آبادی،''خطبات اقبال پر ایک نظر'' ص ۶۹۔